شدت پسندی کے نفسیاتی وسماجی پہلو

اسباب، علاج اور تحفظات کا تجزیاتی مطالعہ

از:

ڈاکٹر محمد رفقی عیسیٰ

حقوق طبع محفوظ ہیں

نام کتاب	:	شدت پسندی کے نفسیاتی وسماجی پہلو
مصنف	:	ڈاکٹر محمد رفقی عیسیٰ
مترجم	:	الیاس نعمانی
کمپوزنگ	:	
صفحات	:	
قیمت	:	

ناشر

فہرست

پیش لفظ	۵
مقدمہ	۷
اصطلاح کی تشریح	۹
جہاد کی بابت غلو پسندانہ رجحانات کے نفسیاتی وسماجی پہلو	۱۴
تصور جہاد کی بابت غلو کے نفسیاتی پہلو	۱۶
تصور جہاد کی بابت غلو کے سماجی پہلو	۲۰
جہاد کے غلو پسندانہ تصورات کی بابت احتیاطی تدابیر	۲۷
مراجع ومصادر	۳۶

چند سطریں مؤلف کے بارے میں

محمد رفقی محمد فتحی عیسیٰ، ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے، مصری شہری ہیں، پھر کینٹا کی، لیگزنگٹن، ریاستہائے متحدہ امریکہ سے ۱۹۷۸ء میں ڈیولپمنٹل سائیکلوجی میں ایم فل کیا۔ جامعہ طنطا مصر اور جامعہ کویت دونوں کی کلیۃ التربیۃ میں ایجوکیشنل سائیکلوجی کے استاذ ہیں، کویت میں ایجوکیشنل ہولڈنگ گروپ کے تعلیمی مشیر ہیں، جامعۃ الخلیج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، کویت کی وزارت تعلیم میں فروغ تعلیم کی مشاورتی کمیٹی کے ممبر ہیں، اور نفسیاتی مطالعات کی مصری تنظیم کے رکن ہیں۔

آپ کی متعدد تالیفات اور مقالات سامنے آچکے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں: **فی النحو النفسی آراء ونظریات، فی النحو الأخلاقی: النظریة، البحث، التطبیق۔ الدافعیة: دراسة نقدیة مع نموذج مقترح۔ نحو أسلمة علم النفس کیف نستخدم عقولنا۔ مصادر التطرف کمایدرکها الشباب فی مصر والکویت: دراسة حضاریة مقارنة۔** ان کے علاوہ آپ کی بہت سی کتابیں سامنے آچکی ہیں۔

متعدد کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی، اور ایم اے وڈاکٹریٹ کے متعدد مقالات کے مشرف رہے۔

پیش لفظ

ایک ایسے زمانے میں جب کہ قدریں پامال ہورہی ہیں، اصولوں میں تبدیلی آرہی ہے اور انصاف، خیر ورواداری کے نشان ہائے راہ ہلکے ہوتے جارہے ہیں، اصطلاحات کی تعیین، ان کے مطالب کی وضاحت اوران کے متعلقہ مضامین پر سیر حاصل بحث بہت اہم مقام رکھتی ہے۔

ایسے کلی معاصر مسائل میں سے جو مسئلہ امت کو درپیش حالات میں سب سے زیادہ اہم ہے، اورجس کے شرعی ،فکری ،عقلی وعلمی پہلوؤں کواجاگر کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ''اعتدال'' ہے، اس لئے کہ یہ ایک شرعی منہج ہے، خیراس سے وابستہ ہے، تہذیبی ڈھانچہ کی نمود اسی پر ہے، آج جب کہ فکری کارواں افراط وتفریط کا شکار ہے، تصورات اور موقفوں کی غلطیوں کا ازالہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

اسی لئے کویت کی وزارت برائے اوقاف واسلامی امور نے اپنے منصوبوں اوراپنی سرگرمیوں میں ''اعتدال'' کونظریاتی وعملی طور پرایک نمایاں مقام دیا ہے۔

اسی توجہ واعتنا کا ایک نتیجہ ''**المركز العالمي للوسطية**'' کا قیام ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ امت کے تہذیبی کارواں کے لئے ایک منارۂ نور بن کر مختلف علما وداعیوں کے فکری ومنہجی مطالعہ کے ذریعہ منہج اعتدال کی اصطلاح وتصور، نیز اس کے ضابطوں واصولوں کی اچھی طریقے پر تعیین کرے، شریعت کے ناقابل تغیر احکام پر کاربند رہ کر، زمانہ کی تبدیلیوں کی رعایت کرکے اور سرچشمہ کو مضبوط کرکے (جس کے زیر سایہ امت متحد رہتی ہے اور جوامت کے مقاصد میں یکسانیت لاتا ہے، اختلاف کا سلیقہ سکھاتا ہے، تہذیبی اشتراک

کا دائرہ وسیع کرتا ہے، اور ایک ایسی منصفانہ صحیح انسانی شراکت کے قیام میں تعاون کرتا ہے جو مثبت رویہ کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے اور تشخص کی حفاظت کا بھی پاس رکھتی ہے) ایک اکیڈمک نظریہ وجود میں لائے۔

سلسلہ ''الأمة الوسط'' بھی اسی کی ایک کڑی ہے، اس سلسلہ کے تحت مختلف مفکرین ،علما اور داعیوں کی تحریریں منظر عام پر آرہی ہیں، یہ تحریریں اس منہج کو پختہ کرتی ہیں، امید ہے کہ یہ سلسلہ تہذیبی کارواں کے اصول منضبط کرے گا، اس کی جڑوں کو مضبوط کرے گا، خدا کرے کہ اس سلسلہ کے تحت افکار ونظریات کا ایسا تنوع سامنے آئے جو تصورات محکم کرے اوران کو گوناگوں وسائل سے بہرہ ور کرے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی فکر رسا سے ایک ایسا نظریہ سامنے لانے میں اپنا کردار ادا کریں جو مختلف خصوصیات کا حامل ہو۔

وماتوفیقی الا باللہ

مقدمہ

گزشتہ دہائی میں دنیا میں ایسے تشدد پسندانہ واقعات ہوئے جن کے نتائج نے دوسری عالمی جنگ کو بھی ماند کر دیا۔ اس تشدد پسندی کی جڑیں گزرے ہوئے برسوں میں ہیں، گیارہ ستمبر کو دہشت گردی کے مسئلہ کے نمایاں ہونے اور اسے اسلامی تعلیمات سے جوڑنے کے سلسلہ میں ایک تاریخی موڑ قرار دیا جا سکتا ہے، اس کے بعد سے متعدد ممالک نے تشدد پسندی کے میدان میں داخل ہو کر دہشت گردی کے ساتھ تعاون یا ہمدردی کا الزام لگا کر کچھ جماعتوں وحکومتوں کے خلاف تشدد کی راہ اختیار کی، اور اس طرح صورت حال اور زیادہ دھماکہ خیز ہو گئی ہے، جس کی سنگینی میں کمی یا ایک فریق کے دوسرے فریق پر غلبہ کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تشدد پسندی کے اسباب ونتائج کی بابت کیے جانے والے تجزیوں اور فکری راہ نمائیوں میں اس رویہ پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے اور ایسے تجزیے خود تعصب کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں، اس رویہ کی تعریف کرتے ہوئے غلو (یا انتہا پسندی) کا سرچشمہ مخصوص جماعت یا ملک کو قرار دیا جاتا ہے، اور دہشت گردی کو مخصوص جماعت سے ہی وابستہ کیا جاتا ہے۔

ہم اس وقت دہشت گردی کی تعریف کے سیاسی پہلوؤں یا دہشت گردی اور جہاد میں پائے جانے والے اس فرق پر بحث نہیں کر رہے ہیں کہ دہشت گردی ایک مجرمانہ وقابل نفریں عمل ہے، جب کہ جہاد ایک فریضہ ہے، اسی لئے اس رسالہ میں غلو، انتہا پسندی اور تشدد پسندی جیسی ان اصلاحات پر گفتگو کی جائے گی جن کا استعمال اہل یورپ کرتے ہیں۔

یہ اصطلاحات اپنی نفسیاتی وسماجی دلالت کی وجہ سے سماجی علم نفسیات میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں، ان کے نفسیاتی وسماجی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی بابت صحیح منہج ہمارے سامنے آ جائے۔

آخر وہ کیا اسباب ہیں جو لوگوں (افراد اور جماعتوں) کو کسی اصول یا طریقۂ زندگی کے لئے اپنی جان تک کی بازی لگا دینے اور اپنی راحت کو خیر باد کہہ دینے پر آمادہ کرتے ہیں؟ آخر کیا اسباب ہیں کہ انہیں دوسروں کی بربادی اپنی آبادی کے لئے لازمی نظر آتی ہے؟ انہیں اپنے اور دوسروں کے لئے موت بجائے قابل احتراز چیز ہونے کے مطلوب ومقصود کیوں لگتی ہے؟ امن، امان اور ایمان باہم متضاد کیوں لگتے ہیں، حالانکہ علم سماجی نفسیات کے نزدیک زندگی، امن اور محبت کی ضرورت ہونے کا احساس فطرت انسانی میں پیوست ہے؟

فرد یا افراد کے ذریعہ ان ضرورتوں کو ترک کر کے ان کے متصادم امور انجام دینے کا مطلب ہے کہ اس کے پس پشت کچھ سماجی ونفسیاتی محرکات بھی ہیں، جن کا جاننا اور جنہیں صحیح رخ دینا ضروری ہے، زیر نظر رسالہ کا مقصد یہی سب ہے۔ واللہ المستعان۔

اصطلاح کی تشریح

کسی بھی اصطلاح پر کلام کرنے کے سلسلہ میں اس کی تشریح ایک بنیادی رکن ہے، کلام کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زیر بحث اصطلاح کے اصل معنی واضح کرے، غلط فہمی کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے اس کے غلط استعمالات سے مکمل اجتناب برتے، اگر چہ اصل معنیٰ کے بعد ان غلط استعمالات سے بھی اعتنا کیا جا سکتا ہے۔

لغوی طور پر جہاد ''جہد'' سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ ہیں وسعت بھر قول وعمل، اور حصول مقصد کے لئے مشقت اٹھانا۔

اصطلاحی طور پر جہاد کا مطلب ہے اپنی ذات اور دیگر سے مجاہدہ اور ان دونوں کو اللہ کے احکام ونواہی کا علم حاصل کرنے اور ان احکام کا اتباع کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرنے پر آمادہ کرنا، تاریخی طور پر مؤرخین اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں: کفار، باغیوں اور مرتدوں وغیرہ سے جنگ کرتے ہوئے مسلمانوں کا اپنی پوری طاقت خرچ کر دینا۔

جہاد کے یہ مؤخر الذکر معنیٰ ہی رائج ہیں، اس کے فقہی معانی، مزید وسیع مفاہیم، متعدد مراتب، اور اس کی بہت سے قسموں (جن کی تعداد اکثر فقہاء کے نزدیک چودہ ہے) کا عام طور پر تذکرہ ہی نہیں کیا جاتا ہے، فقہاء نے ان چودہ قسموں کو چار مراتب میں تقسیم کیا ہے:

اول: نفس سے جہاد

دوم: شیطان سے جہاد

سوم: منافقین سے جہاد

چہارم: کفار سے جہاد۔ یہ دل، زبان، مال اور ہاتھ سے ہوتا ہے۔

کچھ ایسی مصیبتیں بھی ہیں جو مصیبت زدگان کو مجاہدین کے مقام تک پہنچا دیتی ہیں،

تاکہ (مثلاً) اگر کوئی شخص متعدی مرض میں مبتلا ہو کر وفات پا جائے تو وہ دوسروں کی بدبختی کا سبب نہ بنے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ حدیث درج کی ہے کہ ''ایک شخص نے رسول اکرمؐ کے پاس حاضر ہو کر جہاد کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا: ''کیا تمہارے والدین باحیات ہیں؟ اس نے عرض کیا: جی، آپؐ نے فرمایا: پھر ان میں ہی جہاد کرو''۔ شیخین نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ سے دریافت کیا: اللہ کو سب سے زیادہ محبوب کون سا عمل ہے؟ آپؐ نے فرمایا ''وقت پر نماز''۔ میں نے عرض کیا: پھر کون سا؟ آپؐ نے فرمایا: والدین کے ساتھ حسن سلوک، میں نے عرض کیا: پھر کون سا؟ آپؐ نے فرمایا: پھر اللہ کے راستہ میں جہاد[۱]''۔

جہاد کی تاریخی تشریح ہی کے عام ورائج ہونے کی وجہ سے اور حالت جنگ میں ''غضبی طاقت'' کے استعمال پر اس کے مرکوز ہونے کے نتیجہ میں شریعت کے مقاصد وکلیات دینی نصوص کی ایسی تشریحوں کے پس پشت مخفی ہو جاتے ہیں جو ان نصوص کو بار بار دہرانے والوں اور ان کو بنیاد بنانے والوں کی خواہشات سے ہم آہنگ ہیں، اس کے نتیجہ میں ربانی ہدایات سے استفادہ اور ان کی تشریح کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے[۲]۔

تشریح میں پائے جانے والے اس اختلاف کا سبب مسئلہ سے اعتنا کرنے والے اشخاص کے درمیان فکری واقداری اختلاف نیز وسائل وطرز ہائے فکر اور نقطہ ہائے نظر میں پائی جانے والی گونا گونی ہے، اس کی وجہ سے فرد اس رائے کو صحیح سمجھتا ہے جو اس کے ذاتی نظریہ کو مدد پہنچائے اور جس کے ذریعہ وہ دوسری آرا کو بطور گمراہی رد کر سکے، اس طرح اس کا ذاتی اقداری نظریہ اس کے افکار کے عکس کی حیثیت رکھنے والے اس کے رویوں کے لیے اصول ساز ہو جاتا ہے۔

فی نفسہ اختلاف ایک امر محمود اور اللہ تعالیٰ کی سنت تکوینی ہے، لیکن افراد کے مابین اختلاف اگر مخالفت تک جا پہنچے، اور قتل وغارت گری نیز تشدد پسندی کا پیش خیمہ ہو، اللہ نے جن چیزوں کو محترم قرار دیا ہے ان کی حرمت کو یہاں تک کہ بیت اللہ شریف کی حرمت کو بھی

---

[۱] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الایمان باللہ تعالیٰ أفضل الأعمال۔

[۲] ڈاکٹر عمار علی حسن، الفہم الخاطئ لمعانی الجہاد والحسبۃ، جریدۃ البدیل المصریۃ (۲۴/۸/۲۰۰۸ء)

نقصان پہنچانے لگتے تو پھر یہ اختلاف دعوت ومکالمہ کے لئے نقصان دہ اور شریعت اسلامی کے عظیم مقصد کے لئے ضرر رساں ہی ہوگا۔

ذمہ داروں اور قائدین کے بیانات کی طرح طرح کی تشریحات اور تاریخی تحریروں نیز تاریخی واقعات کے تجزیوں کی بابت شک وشبہ پیدا کرنے کی کاوشیں معانی اور پھر تصوارت کی بابت غلط فہمی کے پہلوؤں میں مزید اضافی کرتی ہیں۔

اپنے اقداری نظریات میں ترجیحات کی غلط ترتیب کی وجہ سے افراد ایسے مبنی برحماقت افعال کے مرتکب ہوجاتے ہیں جو مقاصد سے صرف نظر کرکے وسائل کو اہمیت دلاتے ہیں، اور صحیح تصور کے مقام پر غلط تصور کو جگہ دیتے ہیں۔

بسااوقات مختلف ادارے آزادئ اظہار رائے اور تاریخ کے نئے مطالعہ کے نام پر ایک غیر یقینی کی کیفیت پیدا کرتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ قدیم کا رد ہی جدید فہم کی بنیاد ہے، اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان اداروں کے کارندے اس غیر یقینی کی کیفیت میں یہ جانے بغیر مبتلا ہوجاتے ہیں کہ یہ خود ان کی ہی پیدا کردہ ہے، یہ لوگ افکار اور رویوں کی تشکیل میں دین کے کردار سے استناد کرتے ہیں، اور ساتھ ہی تقابلی فقہ میں نظر آنے والے ظاہری اختلافات کو خوب اچھالتے ہیں، تاکہ تدین کو شک اور بے یقینی کے دائرہ میں لے آئیں، اس طرح وہ خود اپنے ہی راستے بند کرلیتے ہیں۔

جامع ازہر کے منبر سے وطن کے دفاع میں جہاد کی اپیل سیاسی قیادت نے کی، اور جنگ آزادی میں فوجی قیادت کا نعرہ تھا: ''اللہ اکبر''، لیکن اس کے باوجود ایک فتوے میں منبروں کو سیاست سے آلودہ کرنے کو جرم مانا گیا، ''دین میں سیاست نہیں، اور سیاست میں دین نہیں'' کا نعرہ اس لئے لگایا گیا تھا کہ ان کا خیال تھا کہ ان کو جہاد پر آمادہ کرنے والے گرفتار کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔

بسااوقات یہ خیال آتا ہے کہ اس گفتگو کی مخاطب کوئی متعین قیادت اور علمی بے راہ روی کو فروغ دینے میں اس کا کردار ہے، اور یہ ایک مقام یا ایک خطہ، یا چند افراد اور جماعتوں کی صورت حال ہے، لیکن حقیقت میں دائرہ اس سے زیادہ وسیع اور دور گامی ہے، اس کے شکار

وہ لوگ بھی ہیں جن کو نئے عالمی نظام کی قیادت میں بڑا مقام حاصل ہے، القاعدہ اور دیگر وہ تنظیمیں جنہیں یہ لوگ دہشت گرد بتاتے ہیں ان پر بہت گفتگو کی جاتی ہے، یہ وہی نظریاتی ساخت ہے جس نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے: ایک مکمل طور پر صحیح ہے اور دوسری اس سے متضاد ہے، اور دنیا کے تمام ممالک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نظریہ کی حمایت کریں ورنہ انہیں مخالف سمجھا جائے گا، اقوام عالم کی تقسیم کے اصولوں کی تشکیل کی طرح ان کی کیفیت متعین کرنے کا حق بھی انہوں نے اپنے لئے خالص کررکھا ہے، جہاد کو انہوں نے دہشت گردی کے مترادف قرار دے رکھا ہے، دہشت گردی کو انہوں نے چند افراد، عقائد ونظریات سے مربوط کردیا ہے، یہ مسئلہ جنگی پالیسی کے تضاد سے عبارت ہے، اور جدید عالمی نظام کے لئے ایک حقیقی اخلاقی بحران بھی ہے، اس لئے کہ اخلاق کا ادھورا نفاذ اخلاق شکنی ہی ہے، غلو ایک منفی قدر ہے، ردفعل میں غلو مزید خطرناک قدر ہے۔

بہت سے اموراور اقدار کی بابت دیدوشنید کے درمیان جو ادراک کی بے یقینی اور بے راہ روی پائی جاتی ہے وہ بہت سے نوجوانوں کو کم از کم اپنے گردوپیش کے واقعات کی بابت ادراک کی اختلافات اور غلط فہمی میں مبتلا کردیتے ہیں، اس لئے کہ امور پر غور وفکر کی بابت بے توازنی انہیں ایسے پہلوؤں کی تحقیق پر آمادہ کرتی ہے جو کسی ایک پہلو کو متضاد پہلو سے زیادہ بہتر ثابت کرے، اور ان سے ایسا تجزیہ کراتی ہے جس کی رو سے وہ کسی ایک کا مکمل دفاع کرتے ہیں اور دوسرے کو مکمل طور پر مسترد کردیتے ہیں، اس طرح وہ ایک طرح کی انتہاپسندی کے شکار ہوجاتے ہیں، اور پھر ان کا مقدر غلو پسندانہ اعمال اور انتہاپسندانہ رویہ قرار پاتے ہیں، یا پھر یہ لوگ اس کشمکش میں مکمل اطاعت کا شیوہ اختیار کرتے ہوئے کسی ایسے لیڈر کو اپنا قائد بنالیتے ہیں جو اپنے آپ کو بطور قائد پیش کرتا ہے یا یہ جسے اپنا قائد بنادیتے ہیں۔

بڑی حیرت ناک بات یہ ہے کہ ۱۹۵۷ء میں لیون فیسٹنگر کے ذریعہ اپنی کتاب When Prophecy میں پیش کردہ نظریہ ''علمی بے راہ روی'' کا دینی پہلو سے اس وقت ربط پیدا ہوگیا جب ایک دینی جماعت نے دنیا کی تباہی کی پیش گوئی ایک ایسے خط کی بنیاد پر کردی جو اس زمین سے باہر کی ایک مخلوق نے ایک عورت کے پاس بھیجا تھا، اس کی بنیاد پر

اس جماعت نے قیامت کے دن کا تعین کر دیا، پھر انہوں نے کہا کہ زمین ان کے خیالات کی وجہ سے تباہی سے بچ گئی۔

یہ لوگ اپنے رجحانات کو فروغ دینے اور لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے دینی جذبات اور مقدس عقائد کو ایک ذریعہ بناتے ہیں۔

جہاد کے تصور کو سخت غصے اور سادہ لوگوں کو نقصان پہنچانے تک محدود کرنے کے نتیجے میں اسلام کی بابت غلط فہمیاں وجود میں آتی ہے، جہاد کے تصور میں غلو کی وجہ سے جہاد اپنی اسلامی حدود و قیود سے نکل کر مبغوض انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، غلو پسند لوگ دین کو جہاد میں اور جہاد کو شدت پسندی میں محصور کر دیتے ہیں، اور دوسرے لوگ جہاد کے ساتھ تفریط کا رویہ اختیار کرتے ہیں، اس طرح دونوں طرف کے لوگ غلو کے شکار ہو جاتے ہیں، اور اس کی بابت چھائے ہوئے دھند کو اور گہرا کر دیتے ہیں۔

جہاد کی بابت غلو پسندانہ رجحانات کے نفسیاتی وسماجی پہلو

اس عنوان کے تحت ہماری توجہ کا مرکز جہاد کی بابت غلو پسندانہ رجحانات کے نفسیاتی وسماجی پہلو ہوں گے، یہ غلو جہاد کی بابت کچھ لوگوں کے رجحانات میں پایا جاتا ہے، خود جہاد کے اندر نہیں، اس لئے کہ جہاد کی اپنی نظریاتی وعملی شرعی بنیادیں ہیں جو اسے دہشت گردی کے ہر شائبہ سے محفوظ رکھتی ہیں، اسی طرح اس موقع پر ''غلو پسندوں'' اور جن لوگوں کو ''دہشت گرد'' کہا جاتا ہے، ان کے درمیان فرق کرنا بھی ضروری ہے۔

''غلو'' کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ ''غلو پسند لوگوں یا جماعتوں'' کے نظریہ اور معاشرہ کے اکثر افراد وقوانین کے نظریہ میں بہت فرق ہے، اور اس نظریہ میں رجحان ورویہ کے اعتبار سے بہت سے منفی پہلو ہیں۔

یہ گفتگو تو تصور کے اعتبار سے ہوئی، لیکن قدر کے اعتبار سے غور کریں تو اس کا حکم اسے زبان کی حدود میں مقید رکھنے کے بجائے اسے مقبولیت ومصالح عامہ کے دائرہ تک (اس دائرہ کے اخلاقی ضابطوں کے اعتبار سے) لے جاتا ہے۔ اس لئے کہ غلو جماعت کی سیاست میں داخل ہو کر اس کے وابستگان کے رویوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے وجود میں آنے اور تقویت پانے کے سلسلے میں سماجی پہلو بنیادی نکتہ ہوتا ہے، اسی پہلو کے اعتبار سے انتہا پسندی کے سرچشموں کی بابت ہمارا ادراک یکساں اور مختلف ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ان کا مطالعہ ضروری ہے[1]۔

---

۱ عیسیٰ: ۱۹۸۸

غلو کو ہم ایک ایسی نفسیاتی حالت کہہ سکتے ہیں جس کی بنیاد نظریہ کی صحت کی وجہ سے دوسرے پر برتری کے احساس، اظہار قوت نیز مخالف کی تباہی کے لئے تشدد کو استعمال کر کے اپنے سماجی وجود کو ثابت کرنے پر ہو۔ انتہاپسندی پر کئے گئے مطالعات بتاتے ہیں کہ انتہاپسندی کی بنیاد مغربی فکر میں پائی جانے والی سنگین ثنائیت اور اسے ردعمل نہ مان کر صرف عمل مانتے ہوئے اس کے مظاہر سے واقف ہونے پر اسے مرکوز کرنے پر ہے، اسی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔

چند افراد کے اندر غلو پائے جانے کے اسباب کو جاننا ضروری ہے، اسی طرح اس سماجی کشش کو بھی جاننا ضروری ہے، جس کے ذریعہ وہ غیروں کو بھی اپنے مخالفین کے خلاف اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں، صرف اپنے معتقدات ونظریات کو ہی صحیح مانتے ہیں، اور دوسروں کو غلط محض، خواہ دوسروں کے کچھ اقوال وافعال اس عقیدہ کے موافق ہی کیوں نہ ہوں۔

جہاد کی بابت نظریہ کی بات کریں تو کسی مسلم جماعت میں جہاد کی بابت غلو پائے جانے کا مطلب ہے احساس تفوق، اور مندرجہ ذیل گروہوں کے خلاف معاندانہ نظریہ وتشدد:

- دیگر مسالک ومشارب کے مسلمان۔
- مقاصد شریعت پر متمسک اعتدال پسند۔
- وہ لوگ جو خواہ اسی نظریہ کی جانب نسبت رکھتے ہوں لیکن اس کو ترک کر رہے ہوں۔
- غیر مسلم۔
- دشمنان اسلام، خواہ انہوں نے قولی وعملی طور پر دشمنی کا اظہار کیا ہو یا نہیں۔

یعنی ''غیر'' کے خلاف تشدد کا استعمال، اور اس کو تباہ کرنا، خواہ یہ تباہی ذاتی ہو یا مشترک وجود کی۔

جہاد کے تصور کی بابت
غلو کے نفسیاتی پہلو

انتہاپسندی کے موضوع پر تحقیق کرنے والے دو اہم اصحاب قلم نے زیادہ وسیع رویہ ہونے کے اعتبار سے غلو پر توجہ دینے کو لازم قرار دیا ہے[۱]، ان کے نزدیک انتہاپسندوں کو ایسی شخصیات ماننا مفید ہے جو غلو کا شکار ہیں اور جنہوں نے اپنی سیاسی وفاداریوں سے صرف نظر اسے اپنا طرز عمل بنایا ہوا ہے، اس اعتبار سے شخصیات کو علامتوں کی ایک فہرست سے جانچنا چاہئے، یہ فہرست بائیس علامتوں پر مشتمل ہے، یہ علامتیں کم اور رویے زیادہ ہیں:

۱- شخصیات کو ہلاک کرنا، یعنی افراد کو تباہ کرنے پر توجہ دینا۔

۲- افراد اور جماعتوں پر تہمتیں لگانا، انہیں برا بھلا کہنا، مثلاً ان کے ساتھ اس طرح کے لاحقے لگانا: (فرار، ممنوعہ، بدنام، نسل پرست اور گمراہ)

۳- جن امور کو ثابت کرنا چاہیں ان کے لئے غلط دلائل، انہیں صحیح سمجھنا یا ان کی مخصوص تشریحات پر اعتماد۔

۴- شخصیات اور جماعتوں کے لئے دہرا رویہ اختیار کرنا۔

۵- اپنے مخالفین اور ناقدین کو شر پسند ماننا۔

۶- دنیا میں خیر وشر کی کشمکش ماننا۔

۷- مخالفین وناقدین کو ذلیل اور اسے صحیح سمجھنا۔

۸- غلط اور غیر ذمہ دارانہ تعلیمی رویے۔

---

۱ George & wilcoox, 1996:54

٩- دشمن کی یہ تعریف کرنا: جسے ہم ناپسند کرتے ہیں اور وہ ہمیں ناپسند کرتا ہے۔

١٠- مباحثہ میں خوف زدہ اور ذلیل کرنا۔

١١- غور و فکر سے محروم کرنے والے الفاظ اور نعروں کا استعمال۔

١٢- دوسروں پر اخلاقی تفوق کا مفروضہ۔

١٣- اخروی فکر کا غلبہ۔

١٤- اپنی نظر میں اچھے ہدف کے لئے ہر طرح کے وسیلہ کے استعمال کو صحیح سمجھنا۔

١٥- عقل کے استعمال کی تذلیل کرکے خالص جذباتی تقاضوں پر عمل۔

١٦- زود حسی۔

١٧- رویوں اور عقائد کے خرافاتی غور و فکر کا استعمال۔

١٨- شکوک پیدا کرکے مسائل پیدا کرنا۔

١٩- اجتماعی غور و فکر کی جانب میلان، اور انفرادی غور و فکر نہ کرنا۔

٢٠- معاندانہ رویہ کی جانب میلان، اور افراد کو اس کا نشانہ بنانا۔

٢١- انتظامیہ بری ہونے کے احساسات کا غلبہ۔

٢٢- سازشوں کی بابت تصدیق کا میلان خواہ یہ سازشیں پائی نہ جائیں۔

واضح رہے کہ ان دونوں محققین کی ذکر کردہ یہ علامتیں انتہا پسندی یا غلو کے نظریاتی وجدانی اور سلوکی تشکیلی عناصر کے مفردات ہیں، اور ان میں اس موضوع کی بابت گزشتہ صدی کی پانچویں دہائی سے لے کر اب تک کے نظریات پر اعتماد کیا گیا ہے، ان عناصر کا مختصر تعارف ہم مندرجہ ذیل طریقہ پر کرا سکتے ہیں:

نظریاتی عنصر:

اس موضوع کے ماہرین کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ انتہا پسندوں (غلو پسندوں) کے فکری معتقدات ان تین نظریات کے اندر ہی ہوتے ہیں:

١- یہ نظریہ کہ اپنی جماعت صحیح عقیدہ سے مستفاد اخلاقی نظریہ کی حامل ہے، اس لئے اس سے متعلق ہونا دائرۂ خیر میں داخل ہونے سے عبارت ہے۔

٢- یہ نظریہ کہ ہماری جماعت ناقابل نظر ثانی صحیح مسلک کی حامل ہے۔

٣- یہ اعتقاد کہ جماعت اپنے دشمنوں سے گھری ہوئی ہے، جو اس کے خلاف کمر بستہ ہیں اور اس کے وجود کے لئے خطرہ ہیں۔

- اس جماعت کے نظریاتی اسالیب میدانی اعتماد اور جذبات پر مبنی انتہا پسندی سے متصف ہوتے ہیں۔
- اپنی ذات اور اس کے افکار و نظریات پر اکتفا۔
- ذات کے تصور "شخصی قدرت کی ذہنی صورت" اور ذات کی کارکردگی "صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع" کے درمیان عدم توازن، ان لوگوں کے نزدیک یہ لوگ صلاحیت اور ڈسپلن سے متصف ہوتے ہیں، اور ان کے اعمال میں ان دونوں اوصاف کے مظاہر نظر آتے ہیں۔

وجدانی عنصر:

- انتہا پسندوں کے اندر محبت اور نفرت کے احساسات امتیازی طور پر پائے جاتے ہیں۔
- شخصیت کے پانچ عظیم عوامل کے معیار پر انتہا پسند بلند مرتبے حاصل کرتے ہیں۔
- دوسروں کے تئیں رویہ میں آخری حد تک جانے کا میلان ان میں پایا جاتا ہے۔
- ان غلو پسندوں کی اخلاقی حس عمل کرنے والے اور عمل کی زد پر آنے والے کے اعتبار سے متاثر ہوتی ہے، نفس عمل کے اعتبار سے نہیں، (چوہوں پر تجربہ کرنا موجب تنقید ہے، لیکن مخالفین کو ستانا اور انہیں قتل کرنا ایک ضروری اور لائق تحریض و آفریں عمل ہے، جانور کے ساتھ ملاطفت ایک اعلیٰ قدر ہے، اور انسان کی مصیبتوں سے تغافل کے اسباب پائے جاتے ہیں)۔
- غیروں کے اعمال میں غلط ارادوں اور رجحانات کی تلاش۔
- نظریہ کی صحت اور عمل کے اخلاقی ہونے کا معیار جماعت سے وابستگی ہے، جماعت سے اختلاف شدید گناہ ہے۔

سلوکی عنصر:

غلو پسندوں کے اکثر سلوک (رویے) مندرجہ ذیل صفات سے متصف ہوتے ہیں:

- تباہی، یہ دوسروں کے لئے فنا اور اپنی ذات کے لئے بقا ہے۔
- شدت پسندی، صلح کم ہمتوں کا طریقہ ہے اور مذاکرات گھٹنے ٹیکنے کے مترادف ہے۔
- حملہ بہترین طرز دفاع ہے۔
- متعدد پہلوؤں کے حامل تاکیدی رویے۔
- ظلم کامیابی کا معیار ہے۔

تصور جہاد کی بابت غلو کے سماجی پہلو

غلو کے سماجی پہلوؤں کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ فیصلہ لینے یا اس کا نفاذ کرنے کے سلسلہ میں اس کی ظاہری شکل و مضمون کے اعتبار سے ظلم و ناانصافی کی بنیاد فرد کی جماعت کا عقیدہ اور اس کی جماعت و دوسری جماعتوں کے درمیان کشمکش ہے، خواہ ان جماعتوں نے سیاسی، قومی، گروہی یا مسلکی رنگ ہی کیوں نہ اختیار کرلیا ہو، جب کہ نفسیاتی پہلو ذات کے تصور اور ذات کی کارکردگی نیز فرد کے شخصی تشکیلی عناصر پر مبنی ہوتے ہیں۔ علم سماجی نفسیات کے مطالعات کے مطابق اس کی بنیادیں متعدد نظریات میں پائی جاتی ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

حقیقی جماعتی کشمکش کا نظریہ (Realistic Group Conflict)[۱]: یہ نظریہ بنیادی طور پر معاشی پہلوؤں کا حامل ہے، معاشی ابتری یا اس کا خوف وجود کے لئے خطرہ ہے، اور اسی وجہ سے دوسرے کے ساتھ برتاؤ میں غلو پسندانہ طریقوں کا باعث ہے، اور اس رجحان کی مؤید ایسی جماعتوں سے تعلق کا راستہ ہموار کرتا ہے[۲]۔

نظریہ سماجی تشخص Social Identity Theory: اس نظریہ کے مطابق مذکورہ بالا نظریہ اپنی قدر و قیمت کے باوجود غلو کے سامنے آنے میں معاشی ابتری کو بنیاد قرار دینے کے سلسلے میں کوتاہ و غلط ہے[۳]۔ اس کے مطابق غلو کے طرز عمل پر عمل پیرا جماعت کے ارکان

---

۱ Sherif,1996

۲ Turpin-Petrosino,2002

۳ Brown & Capoza,2000

’’ہم‘‘اور’’غیر‘‘ کے درمیان پائے جانے والے فرقوں کو گہرا کرتے ہیں، اس طرح یہ نظریہ اس خلا کو پر کرتا ہے جو مذکورہ بالا نظریہ میں تشخص کو خطرہ درپیش ہونے سے وجود میں آنے والی کشمکش میں غلو کے مطالعہ کے وقت سامنے آتا ہے[۱]۔ مختلف فرقہ پرست جماعتوں کے درمیان پائی جانے والی کشمکش کے مطالعات اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ہر فریق اپنی صفائی ثابت کرنے کے لئے تشدد کا استعمال کرتا ہے[۲]۔

اس طرح زیر نظر نظریہ میں نفسیاتی وسماجی پہلو اس طور پر جمع ہوجاتے ہیں کہ ذات کا تصور اور اس کی حفاظت کے جذبات سماجی نقطۂ نظر سے انتہا پسندی یا غلو کی نفسیاتی تشریح میں سرگرم کردار ادا کرتے ہیں، تشخص کے خاتمہ کا ڈر اس’’غیر‘‘ کے ساتھ شدت پسندی کا رویہ اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو جماعت کی خصوصیات کو ختم کرکے اور افراد کو اپنے میں ضم کرکے جماعت کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقلیتیں انتہا پسندانہ مسالک کا شکار ہوکر غلو کا طریقۂ کار اختیار کرتی ہیں[۳]۔ اس معاشی پہلو کی بابت کیے گئے مطالعات کے نتائج نے نظریۂ سماجی تشخص سے’’بے یقینی‘‘ کے پہلو کا کردار سامنے لانے پر آمادہ کیا، اس نظریہ کے حاملین کا دعویٰ ہے کہ اس پہلو کی وجہ سے افراد کسی انتہا پسند جماعت میں شمولیت سے پہلے کئی مرتبہ سوچتے ہیں۔ یہ پہلو لوگوں کو ان انتہا پسند جماعتوں میں شمولیت پر آمادہ کرتی ہیں جو’’بے یقینی‘‘ کے اپنے احساس، اور ان بنیادی اصولوں کے نہ پائے جانے کی وجہ سے جن پر ایمان ویقین ضروری سمجھا جاتا ہے، اور اپنے گردوپیش کی بابت دیدوشنید میں فرق ہونے کی وجہ سے غلو اور تشدد کا طریقہ اختیار کرتی ہیں[۴]۔

سماجی تشخص کے ماہرین کا خیال ہے کہ ان مطالعات کے نتائج یہ بتاتے ہیں کہ سماجی تقسیم کے اصولوں کے تعین کی بابت غلو اور تعصب کی بنیاد اس ماحول میں پائی جاتی ہے جو ان

---

۱ Seyle:2007

۲ Glaser, Dixit & Green:2002

۳ Chua, 2003

۴ Hogg & Terry,2000

فرقوں کو فکروعمل کی سطح پر ختم کرنا چاہتا ہے[۱]۔

نظریۂ اثبات ذات Self Verification: اس نظریہ کے متبعین کا خیال ہے کہ اثبات ذات کی ضرورت امتیاز ثابت کرنے اور ناقابل صلح ریڈ لائٹس کی تعیین کے لئے پرتشدد طریقوں کو اختیار کرنے اور بنیادی فرقوں کو یقینی بنانے کے افراد کے رجحان کا اہم سبب ہے، ایسے لوگ اپنی جن آرا اور اپنے جن نظریات کو صحیح سمجھتے ہیں ان کے لئے جہاد کرتے ہیں[۲]۔

یہ نظریہ سماجی تشخص کے نظریہ سے سماجی ذات کے تحفظ کو امتیاز کے تعیین اور اس کے دفاع میں آخری حد تک جانے کے سلسلے میں متفق ہے، اس نظریہ کے حاملین کبھی کبھی اپنی رائے کے سلسلہ میں صحیح طریقے اختیار کرتے ہیں، اور غلو وانتہا پسندی کو باوجود لڑائی کی قدرت کے چھوڑ دیتے ہیں، یہ چیز سیاسی فکری[۳] اور دینی[۴] حلقوں میں عام ہے، اور سیاست ودین کی جامع کشمکشوں میں بھی نظر آتی ہے[۵]۔

اس طرح تشخص کا خاتمہ انتہا پسند جماعتوں کے سلسلہ میں ایک اسٹراٹیجک غلطی اور دوسری انتہا کے غلو کا باعث ہے۔

جب صرف ظاہری طور پر’’تہذیبوں کی کشمکش‘‘ کے تصور کی جگہ پر’’تہذیبوں کے مابین مکالمہ‘‘ نے لے لی ہے، اور ان دونوں کا ہدف یکساں ہی ہے، یعنی تشخص کا خاتمہ، تو پھر نتیجہ صرف ناکامی کا ہی نکلے گا، زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس مشابہت کو ختم کرکے اپنے اور غیر کے تصور کی بابت راہ نما اصول تجویز کئے جائیں، اختلاف کو تعارف وتعاون کا ذریعہ بنایا جائے، مخالفت وخونریزی کا نہیں، اقدار کی توضیح کا طریقۂ کار اس سلسلے میں اپنے مناسب مقام پر آئے گا[۶]۔

---

۱ Seyle:2007

۲ Seyle:2007

۳ Syle & Pennebaker 2007

۴ Syle & Swann,2006

۵ Shamir & Sagiv- Sehiftee,2006

۶ عیسیٰ: ۱۹۸۴

ملکی و بین الاقوامی تجزیاتی رپورٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی معاشروں میں قیام پذیر نوجوانوں میں جہاد کی بابت غلو کی بنیادیں سماجی اجنبیت، اور انہیں ظلم و جبر کا نشانہ بنائے جانے میں پیوست ہیں، اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی پالیسیز کے منفی نتائج کی وجہ سے ان نوجوانوں میں اپنے اور اپنے وطنوں کے حالات کی بابت بے چینی بھی اس کی بنیاد ہے۔

یہ لوگ اپنے ملکوں میں آباد اپنے اہل خانہ کے خراب حالات کا سبب سیاسی مقتدرہ کی پالیسیز، معاشی سامراج اور ذات کے تصور کے بنیادی تشکیلی عنصر دینی تشخص کو ختم کرنے کی کاوشوں کو بتاتے ہیں، ان کے علاوہ دیگر اسباب میں معاشی ابتری، زندگی کے مصارف بڑھنے کے ساتھ ساتھ بے روزگاری کا وہ پھیلاؤ بھی ہے جو حکومتوں کے خوشحالی کے دعوؤں سے متصادم ہے[1]۔

جہاد کی بابت غلو کا مقابلہ کرنے کے طریقے:

غلو کی بابت صحیح رویہ کی تعیین کی بنیاد اس کے تصور، اس کی نوعیت اور اس کے اسباب سے آگہی پر ہے۔ اگلے صفحات میں ہماری توجہ کا مرکز غلو کو وجود میں لانے والے اور اسے تقویت پہنچانے والے اسباب کے خاتمہ نیز صحیح تعمیری رویوں پر آمادہ کرنے والے امور واسالیب کی بابت تجاویز ہوں گی، اس سلسلہ میں اپنی گفتگو کا آغاز ہم جہاد کی بابت پائے جانے والے غلو کے سلسلہ میں عام پالیسیوں سے کریں گے، یہ پالیسیاں منفی غلو پیدا کرتی ہیں، اور اس لئے مطلوبہ ہدف کے حصول سے محروم رہتی ہیں۔ ایسی پالیسیاں یہ ہیں:

- ان کے خلاف فوجی طاقت، خفیہ معلومات اور قوانین کا استعمال، ان کے امکانات کم کرکے اور ان کے وسائل ختم کرکے ان کا خاتمہ۔ ایسی کوششوں میں حقیقی نفسیاتی وسماجی اسباب پر توجہ نہیں دی جاتی ہے۔
- اختلافات پیدا کرنا، بسا اوقات غلو کا مقابلہ کرنے والے لوگ کسی ایک گروپ کی

۱۔ Kooros,2006

حمایت کردیتے ہیں یا انتہا پسندی کی صفوں میں پھوٹ ڈال دیتے ہیں، اور پھر ان کی جماعت کے اندر پھوٹ ڈال دی جاتی ہے، اور ایک اعتدال پسند عنصر سامنے لایا جاتا ہے، یہ طریقہ بھی حقیقی اسباب سے اعتناء نہیں کرتا ہے، اور اس لئے بالآخر مزید سخت انتہا پسندی کے رجحانات کا سبب بنتا ہے۔

- مخالف گروہ، غلو کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ لوگ انتہا پسندی مخالف جماعت تشکیل دیتے ہیں، اس پالیسی کے نتیجہ میں انتہا پسند جماعت اپنے نظریات اور طریقۂ کار میں تبدیلی پر مجبور ہوتی ہے۔
- اعتدال پسندوں کی مدد، اس پالیسی کے تحت انتہا پسند جماعت پر توجہ دینے کے بجائے اعتدال پسند جماعت پر توجہ دی جاتی ہے، اس لئے کہ اعتدال پسندی جس قدر مقبول ہوگی انتہا پسندی از خود اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔ لیکن یہ پالیسی نفسیاتی وسماجی امور سے زیادہ فلسفیانہ بنیادوں پر اعتماد کرتی ہے۔
- خفیہ رابطہ یعنی انتہا پسند جماعت کو قابو میں کرنے کے لئے خفیہ یا بالواسطہ مذاکرات کرنا، اس پالیسی کی خراب بات بے اعتمادی ہے، ان کوششوں کی ناکامی کا سبب یہی بے اعتمادی اور ناواقفی ہے۔
- مذکورہ بالا تمام پالیسیاں ایک ساتھ اختیار کرنا، یعنی متعدد طریقے استعمال کرنا ور اقدامی ودفاعی نیز سختی اور نرمی کی پالیسیاں اختیار کرنا، متعدد پہلوؤں کی حامل یہ پالیسی عام طور پر بے اعتمادی اور شبہات بلکہ بسا اوقات نظریات میں اختلاف کا سبب ہوتی ہے اور مزید بے یقینی کا سبب بنتی ہے، پھر یہ بے یقینی تعصب وغلو کو جلا دیتی ہے[1]۔

امن بنائے رکھنے کی پالیسی، اعتدال پسندی کو فروغ دینا، مشترکہ ہدف کی تعیین کے لئے علانیہ براہ راست رابطہ، وسائل کے مثبت اور منفی پہلوؤں میں فرق کرنا، صحیح نفسیاتی وسماجی پہلوؤں پر قائم پروگرام تشکیل دینا۔

انتہا پسند جماعتوں اور انتہا پسند مخالف جماعتوں کی پالیسیوں کے گہرے جائزہ سے یہ

۱۔ Bartali & Columan,2003

بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان دونوں طرح کی جماعتیں غلو کی شکار ہیں[1]۔ نیز امن کا قیام سب کی ذمہ داری اور شرعی فریضہ ہے[2]۔ ان پالیسیز کے لئے بڑی اور دقیق سطح پر سرگرمیوں کی ضرورت ہے۔

● بڑی سماجی سطح (Macro Social Level) پر ان کاموں کی ضرورت ہے:

- ظلم وعدم مساوات میں کمی کر کے رفتہ رفتہ ان کا خاتمہ۔
- حقوق انسانی کا احترام اور ان کی پاسداری۔
- روشن خیالی کو عام کر کے انتہا پسند نظریات کو کمزور کرنا۔
- مسلح دستوں کی کارروائیوں میں کمی، اور ان کی کارروائیوں میں انتقامی صفت کو کمزور کرنا۔
- سماجی ذمہ داری اور اس کی پرامن بنیادوں طاقتور کرنے والے اداروں کی تشکیل۔
- حقیقی جمہوریت کی فضا قائم کرنا، اکثریت کے رجحانات اور اقلیتوں کے مطالبوں کا احترام۔
- تعمیری تعلقات کے لئے اقداری ضابطوں کی تشکیل۔
- مہذب معاشرہ کے اداروں کو تقویت پہنچانا۔
- مجوزہ نظریات کی بابت صحیح معلومات جمع کرنا۔

● دقیق سماجی سطح (Micro Social Level)

- کسی دوسرے کی ایسی تصویر کشی سے اجتناب جس سے اس کی حقارت جھلکتی ہو۔
- افراد کے درمیان بے تعلقی کی جگہ پر مثبت رابطہ اور ہمدردی کے احساسات کو تقویت پہنچانا۔
- تہذیبوں کے درمیان باہمی مفاہمت کو تقویت پہنچانا۔
- روزگار کو ایک حق اور ذمہ داری مانتے ہوئے نوجوانوں کی صلاحیتوں کو جلا دینے اور ان کے لئے باعزت زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے معاون حالات پیدا کرنا۔

[1] Gruen,2003

[2] یوسف: ۱۴۲۵ھ

- دوسرے کی تحقیر کرنے والے طریقوں کا خاتمہ۔
- انسانی عزت کی یقینی بنانے والے رویوں کو اختیار کرنا۔
- افراد اور جماعتوں کے درمیان بے تکلف تعلقات اور مصالحت کے لئے رابطہ کے مواقع فراہم کرنا۔

بعض لوگ ان پالسیز کو غیر عملی اور ناقابل عمل سمجھتے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ ناممکن نہیں ہیں، ہاں ان کے لئے دوراندیشی، سچی نیت اور اتنے انتظار کی ضرورت ہے کہ یہ پالیسیز توفیق خداوندی سے اپنے نتائج دے سکیں۔

انسانی کشمکش میں دونوں فریقوں کی طرف سے تشدد کا استعمال مسائل کو حل نہیں پیچیدہ کرتا ہے، فریق مخالف کی خواہشات کو نیست ونابود کرنے پر یقین رکھنے والا تشدد کا طریقہ غلو کا باعث ہوتا ہے[1]، جب کہ محبت کا طریقہ دوسرے کی خواہشات کی اصلاح کرتا ہے، تاکہ اس کی خواہشات ہر فریق کی تہذیبی و مذہبی خصوصیات کے احترام اور معاشرہ کی تقویت کی ہو جائیں، اس لئے کہ اسلام امن کا داعی ہے، اور رسول اسلام رحمت تھے۔

اس اصلاحی عمل کا دائرہ معاشرہ کے تمام اداروں: خاندان، مکاتب فکر، معاشرہ اور حکومت پر محیط ہے۔

[1] یوسف: ۱۴۲۵ھ

جہاد کے غلو پسندانہ تصورات کی بابت احتیاطی تدابیر

غلو پسند تحریکیں اور جماعتیں درحقیقت سیاسی، معاشی اور سماجی بے اطمینانی کا نتیجہ ہیں، یعنی غیر تجزیاتی مقصد وتبدیلیوں کے ساتھ وجود میں آنے والی غیر مقصود تبدیلیاں کم نظری اور کوتاہ بینی کی وجہ سے غیر متوقع نتائج کا سبب بنتی ہیں، مثال کے طور پر یہاں ہم پرائیوٹائزیشن کے رجحان کا تذکرہ کررہے ہیں، جس کے نتیجہ میں معاشی میدان میں حکومت کا کردار کم ہوجاتا ہے۔

حکومت کو اس رجحان کے اختیار کرنے پر پبلک سیکٹر کے متعدد مسائل نے مجبور کیا ہے، جیسے وقت سے پہلے رٹائرمنٹ، بے توجہی، قیمتوں میں اضافہ اور روزگار کے مواقع میں کمی، اس صورت حال نے روزگار کے خواہش مند نوجوانوں کو اس تردد میں ڈال دیا کہ کیا وہ ایک ایسے نظام کا حصہ بنیں جس کے لئے وہ تیار نہیں ہیں، یا اپنے مانوس نظام کا دفاع کریں، یہ دونوں نظام باہم برسرپیکار ہیں، لیکن ان کو ٹھکراتے ہیں، انہیں اپنی کم معلومات اور کم صلاحیتوں کا احساس ہے، نیز یہ بے یقینی کے شکار ہیں اور انہیں حال، مستقبل قریب یا مستقبل بعید کے حالات پر بھروسہ بھی نہیں ہے، یہ صورت حال کئی متضاد رجحانات کا باعث بنتی ہے، ایک رجحان کے نزدیک روشن خیالی کے ساتھ اور تاریخ کے تجربات کی روشنی میں حالات کو سمجھنے کی عقلی کوششیں کرنی چاہیں، اور دوسرے رجحان کے نزدیک قائدین کی غلط پالیسیز اور ان کے متبعین کی ناواقفی کا لازمی نتیجہ یہ بے یقینی ہے، ان دونوں رجحانات کے اندر دوسرے

سے اجتناب یا اس کے خاتمہ کا احساس پایا جاتا ہے، یہ احساس ہی غلو کا اصل محرک ہے۔

اوپر کی گئی گفتگو سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جہاد میں غلو اپنے لئے ہم آہنگ ماحول میں پیدا ہوتا ہے اور معاون حالات میں ترقی پاتا ہے، اس کا آغاز دوسرے سے برابری قائم کرنے کے لئے تصادم کے نظریہ سے ہوتا ہے، اور اختتام اپنے و دوسرے کی تباہی پر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ یا تو ہم بھی ساتھ ساتھ تیریں گے ورنہ سب کو غرق کردیں گے، تربیتی اور دینی پہلو احتیاطی تدابیر کی حیثیت رکھتا ہے، اور جو لوگ غلو کا شکار ہوجاتے ہیں ان کے لئے علاج کا بھی سامان ہے۔

غلو پائے جانے کے تربیتی، سماجی، معاشی وسیاسی اسباب ہوتے ہیں، اس کے پیچھے ایک ایسا ڈاگ میٹک تربیتی فلسفہ پایا جاتا ہے جو اپنے ہدف سے بے تعلق ہوتا ہے، اور اس کی مدد ایسے تعلیمی طریقے کرتے ہیں جو طلباء کے حالات سے بے تعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً تعلیمی مراحل دراصل وسائل کڑیاں ہوتے ہیں، ہر مرحلہ اپنے اگلے مرحلہ تک پہنچاتا ہے تاکہ انجام کار کوئی نوکری یا روزگار مل سکے، لیکن طلباء اس تسلسل کو نقصان پہنچاتے ہیں، اصلاحی طریقے ایک ایسے شہری کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ہوتے ہیں جو روزگار کے میدان میں مقابلہ پر قادر ہو، اور انسانی سرمایہ کو حاصل کرسکے، (لیکن یہ سب گمراہ کن باتیں ہیں جو انسانی سرمایہ کو صرف کے خاتمہ اور تباہ کن بے روزگاری تک پہنچادیتی ہے)۔ قوانین اور خدمتی اداروں کا اصل کام انسانی عزت کی حفاظت ہے لیکن وہ اس عزت کی ہتک میں مشغول ہوجاتے ہیں، ان متصادم امور کی وجہ سے انتہاپسندی اور تشدد پسندی کے رجحانات سامنے آتے ہیں، پھر ردعمل میں افہام وتفہیم کے بجائے ظلم وجبر کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے، اور پھر تشدد کا ایک ایسا سلسلہ وجود میں آجاتا ہے جس میں عمل وردعمل کی تمیز نہیں کی جاتی۔

الف: نظام تربیت کی تجدید

تربیت کو معاشرہ میں تبدیلی کی بنیاد مانا جاتا ہے، اور خود تربیت بھی معاشرہ میں تبدیلی سے متاثر ہوتی ہے، تربیتی ارتقا کے منصوبہ سازوں نے اس مسئلہ پر بہت توجہ دی ہے، لیکن انہوں نے ایک کلی ہمہ گیر نظریہ کے بجائے متعدد جزوی نظریات پر توجہ دی ہے، جیسے نصاب پر

نظر ثانی، ٹیکنالوجی کا استعمال اور مادی وسیاسی پہلو کے لئے نئی ذمہ داریوں کی تشکیل۔ان لوگوں کو امید ہے کہ ان اقدامات سے تعلیم اور بازار کے تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوسکے گی، سیاسی میدان میں بھی ان لوگوں کی کاوشوں کا یہی حال ہے، ان منصوبہ سازوں کے حالیہ اقدامات اور ان کے مستقبل کے ارادے یہ ہیں، لیکن اس نظریہ کے اصولوں سے الگ بھی بہت سے ارتقاءات ہو رہے ہیں، ان میں سے کچھ کا سرچشمہ داخلی ہے اور کچھ کا خارجی۔

ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا جو میدان عمل ہے وہ ان تیز رفتار تبدیلیوں کے اندر ہی محدود نہیں ہے، پھر یہ نوجوان جس ماحول میں رہ رہے ہیں وہ ایک ایسے خاندان کا ماحول ہے، جس میں باہمی تعلقات کی بابت منفی اقدار کا بول بالا ہے، ان اقدار نے اس خانوادہ کے افراد کے درمیان باہمی رابطہ وتعلق اور ایک دوسرے کی رعایت کے جذبہ کو بہت نقصان پہنچایا ہے، اور آپسی اختلافات کو شدید تر کردیا ہے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں مروت کم اور سختی وتشدد پسندی غالب ہے، اس کا اندازہ ہمیں جرائم کی کمیت ونوعیت کے جائزہ سے ہوسکتا ہے۔ دوسرے اعداد وشمار نفسیاتی امراض میں اضافہ کا پتہ دیتے ہیں۔

تربیتی نظام سے وابستہ افراد اس بات کا ادراک نہیں کرسکے کہ یہ افراد تعلیمی اداروں کے تعلیمی نظام اور معاشرہ کے تربیتی نظام کی ہی پیداوار ہیں، یہ ابھی تک ایک ایسے کوتاہ تعلیمی نظریہ پر کاربند ہیں جو غور وفکر اور مکالمہ کی صلاحیتوں سے ناآشنا افراد پیدا کرتا ہے۔

ہمارا تعلیمی طرز جو کہ استاذ وشاگرد کے درمیان مطلوب کی تعیین میں تلقین، حفظ اور دہرانے کے سہ اموری طرز عمل سے عبارت ہے افراد کو فکری یا وجدانی یقین کے مرحلہ تک نہیں پہنچاتا ہے، اس طرز تعلیم میں طلباء ایک دوسرے کی گفتگو سنجیدگی، توجہ اور احترام کے ساتھ سننے کے عادی نہیں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی رائے کی مخالف رائے کو برداشت کرنے، باہم مکالمہ اور تعاون کے بھی عادی نہیں ہوتے ہیں، ''ایک ساتھ تیریں گے یا سب کو ڈبو دیں گے'' کے نظریہ کے برخلاف ایسا ہوسکتا ہے کہ بغیر لڑے جھگڑے سب ایک ساتھ تیرتے رہیں، اس لئے کہ بے سوچے سمجھے لڑنے سے تو سب ہی ڈوب جائیں گے۔

جو افراد دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا نہیں جانتے ہیں ان سے اس کی توقع بھی نہیں

کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ وہ باہمی رابطہ، اعتماد قائم کرنے اور اسے بنائے رکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں، قیادت اور اختلافات سے نپٹنے کے طور طریق سے وہ بے گانہ ہوتے ہیں، ان کی پرورش وپرداخت ایک ایسے نظام تعلیم میں ہوئی ہوتی ہے جو اختلافات کو سنگین بناتا ہے، دوسرے کے تئیں نفرت وعداوت کے احساسات پیدا کرتا ہے، اوروں کے عیوب کی تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے اور دوسروں کو تباہ وبرباد کرنے کے مواقع کی تلاش کراتا ہے، یہ نظام تعلیم بھلائیوں میں آگے بڑھنے، تقوے اور نیکی کے کاموں میں تعاون کرنے اور دوسروں کے اعذار سمجھنے کا جذبہ پیدا نہیں کرتا ہے۔

نظام تربیت کا مطلوبہ کردار افراد کے لئے بالخصوص اور معاشرے کے لئے بالعموم علمی ڈھانچہ کی تشکیل سے عبارت ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نظام میں تبدیلی کرنے اور تجرباتی مطالعات سے مدد لینے کے نظریہ نے تربیتی لٹریچر میں خاصی مقبولیت حاصل کی ہے، گوکہ ایسی اکثر تحریریں طبیعی علوم کے میدان کی ہیں، لیکن عملی طور پر اس نظریہ کے کچھ اثرات نظر نہیں آتے ہیں۔

اب وہ وقت آگیا ہے کہ تربیتی نظام کے ذمہ داران فکر کی تشکیل جدید پر توجہ دیں، یعنی باربار دہرائی جانے والی معلومات کے دائرہ سے باہر نکل کر ان افکار ونظریات کو اختیار کیا جائے جن کی بنیاد ایک ایسے ماڈل پر ہو جس کے علمبردار ہو کر اساتذہ علم کو جامد اور ناقابل نظر ثانی سمجھنے کا نظریہ چھوڑ دیں، اور علم کے اضافی اور قابل تغیر ہونے کے نظریہ کو اختیار کریں، اور اس طرح طالب علم اپنے علمی نظریات کو ذاتی غور وفکر کے ذریعہ خود تشکیل دے سکے گا اور پھر اس میں تبدیلی بھی کرسکے گا۔

نظام تربیت میں یہ نوعیتی انقلاب تعلیمی عمل کے نتائج کو بہتر کرے گا اور غور وفکر کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ایسے افراد پیدا کرے گا جو اپنے زمانہ کے تقاضوں اور تبدیلیوں سے آگاہ ہوں گے، یہ افراد مختلف فیہ نظریات کے اختلافی پہلوؤں سے واقف ہوں گے اور ان کو برتنے کا طریقہ جانتے ہوں گے، اس کے علاوہ یہ تبدیلی جہاد کے تصور کی بابت غلو پسند جماعتوں سے اعتنا کرکرنے والوں کی بھی مدد کرے گا۔

ب: دینی خطاب کی تجدید:

اوپر ہم نے لکھا ہے کہ عقل کی تشکیل صرف تعلیمی اداروں میں نہیں ہوتی ہے، بلکہ ذرائع ابلاغ، دینی تربیت کے ادارے (جیسے گھر اور مسجد وغیرہ) کا بھی اس میں کردار ہوتا ہے، ان ابلاغی اور تربیتی اداروں کا حال بھی تعلیمی اداروں جیسا ہی ہے، بعض تعلیمی چینلس میں پیش کئے جانے والے پروگرام اسکول کے درجہ کی کارروائیوں کی تکرار ہی کرتے ہیں، جب کہ کچھ ٹیلی ویژن چینلس، اخبارات اور ریڈیائی پروگرام مکالمہ اور متعدد آرا کو سامنے لانے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، لیکن مسجد روایتی تعلیم گاہ کی طرح کا ہی ادارہ رہی ہے یا کم از کم لوگ ایسا چاہتے ہیں، یہاں تک کہ مسجدیں متعین مکتبۂ فکر کے لوگوں سے جانی جاتی ہیں، انتظامیہ بھی اسی تصور کے متبع ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ کچھ مسجدیں سنیوں کی ہیں اور کچھ شیعوں کی ہیں، کچھ اخوانیوں کی ہیں اور کچھ سلفیوں کی ہیں۔

صورت حال اس وقت اور زیادہ خراب ہوجاتی ہے جب جامد سرچشمہ (داعی) اور غور وتدبر سے عاری فیض یافتہ کا اجتماع ہوتا ہے، اس کے نتیجہ میں معاشرہ کے اندر اختلافات فروغ پاتے ہیں، فکری رجحانات کے حاملین ایک دوسرے کے خلاف ہوجاتے ہیں، اور مسالک باہم دست وگریباں نظر آتے ہیں، اگر ان میں سے کئی کا شریعت کی ہدایت کے مطابق ایک دوسرے کے نظریات پر غور وفکر کے لئے نیز ایک ایسی امت کھڑی کرنے کے لئے ہوتا ہے جو معروف کا حکم دے، منکر سے روکے، قرآن پر تدبر کرے، خبروں کی تحقیق کرے، نظریات کی چھان پھٹک کرے اور امکانات کی حد تک استطاعت حاصل کرے تو دیگر مواقع ایسا نہیں ہوتا ہے۔

حالیہ دینی خطاب کے بہت سے تصورات غور وفکر کے متقاضی ہیں۔

طریقہ ہائے کار کا تنوع لازمی طور پر اصول سے ہٹ جانے یا عقیدہ میں فساد سے عبارت نہیں ہے، بلکہ اس تصور کا جمود تیز رفتار تبدیلیوں کے اس عہد میں شریعت کی صفت دوام اور اللہ کی سنت تکوینی سے متصادم ہے، اگر اب کچھ ایسے حالات پیش آتے ہیں جو پہلے نہیں تھے تو ان پر غور وفکر آج کل کے ہی لوگوں سے مطلوب ہوگا، متقدمین سے نہیں، ایسی صورت

میں یہ سمجھنا کیسے صحیح ہوگا کہ انسان یا تو پیش رووں کا مقلد جامد ہوگا ورنہ مکمل طور پر دین بیزار، مہم یہ بھول جاتے ہیں کہ تکلیف شرعی وسعت کی حامل ہے، یہ وسعت ذات، زمانہ اور علاقہ کے اعتبار سے ہے۔

یہ دینی جامد رویہ لوگوں کو الگ الگ دھڑوں میں تقسیم کرتا ہے، اور ان بہت سے لوگوں کو بے یقینی کا شکار کرتا ہے جو علمی، وجدانی اور سلوکی طور پر تذبذب کا شکار ہوتے ہیں، نتیجتاً وہ غلو کے شکار ہوجاتے ہیں۔

غلو کے مقابلہ کی پالیسیز دو بنیادی نظریات کی حامل ہوتی ہیں، ایک نظریہ غلو کو ایسا ''مرض'' سمجھتا ہے، جو از خود پیدا ہوتا ہے، دوسرا نظریہ اسے فرد کی ذاتی تشکیل یا اس کے گردوپیش میں پائی جانے والی کمیوں کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ پہلے نظریہ والوں کے نزدیک دین پسند معاشروں میں پروان چڑھنے والے جوانوں کی فطرت میں تدین ہوتا ہے، اور تدین انتہاپسندی کے مترادف ہے، اس نظریہ کے غلو پسند حاملین کا خیال ہے کہ اس ''فطرت'' میں تبدیلی کی کوشش بے سود ہے، دین پسند شخصیت یا تدین کی فطرت کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے، یعنی ان لوگوں کے نزدیک جن افراد کو ''انتہاپسند'' کہا جاتا ہے انہیں نیست ونابود کر دینا چاہئے، وہ مکالمہ یا اصلاح کی کوشش کے قابل نہیں ہیں۔

دوسرے نظریہ کے علم بردار انتہاپسندوں کا خیال ہے کہ فریق مخالف سے گفتگو کرنا نا کرنا سب برابر ہے، انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہئے، اور بے دین وشیطانی مملکت کو مشین گنوں اور ٹائم بموں سے ہی ختم کیا جاسکتا ہے، چونکہ ان دونوں فریقوں کی انتہاپسندی ردعمل کا نتیجہ ہے، اس لئے اس کے ذریعہ بس کچھ انتقامی وقتی کامیابیاں تو حاصل کی جاسکتی ہیں، لیکن اس سے کوئی تعمیری پیش رفت نہیں ہوسکتی ہے۔

تاریخ میں ایسی پالیسیز کے نمونے بکثرت ہیں، کچھ لوگ غلو کو سماجی، معاشی، سیاسی حالات نیز معلومات ذرائع میں تباہی کے وسائل کی کثرت کا نتیجہ مانتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک سرچشموں کو خشک کر دینا ہی بہتر ہے، اور نظریہ واس کے حاملین کو ختم کرنے سے بہتر اس کے اسباب کو ختم کرنا ہے، ان لوگوں کے نزدیک متوقع غلو پسندوں پر سے ظلم کا خاتمہ

کر کے اوران کے لئے باعزت زندگی کے اسباب فراہم کر کے غلو کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

دونوں فریقوں کا عیب یہ ہے کہ وہ محدود نظریہ کے پہلوؤں پر جمود کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں، پہلا فریق اپنے نظریہ کی صحت پر مطمئن ہے اور اپنے نظریہ کے مطابق غلو پسندوں کے خاتمہ کے لئے تشدد کی آخری حد تک جا سکتا ہے۔

دوسرا فریق سطحی تجزیاتی اسلوب اختیار کرتا ہے، اس کو جو اسباب سمجھ میں آتے ہیں ان کے اعتبار سے کام کرتا ہے، اور ابراہام موسلو کے نظریہ کے مطابق فرد و مبینہ غلو پسند کی ذات اور اس کے معاشرہ سے متعلق بنیادوں سے صرف نظر کرتا ہے، یہ فریق افراد و جماعتوں کے لئے رہائش، کھانے اور لباس جیسی ضروریات فراہم کرتا ہے، لیکن ان کے اس خیال کو باقی رکھتا ہے کہ ان کا امن وامان اس کے ہاتھ میں ہے، تاکہ وہ کسی ایک معاملہ پر متفق نہ ہو سکیں، بلکہ وہ انہیں الگ الگ گروہوں میں منقسم ہی رکھتا ہے، بلکہ بسا اوقات ان میں خونریزی کرواتا رہتا ہے تاکہ ان میں وہ بات نہ پیدا ہو جائے، جس سے یہ ڈرتا ہے۔

ج: سماجی توازن کا ازسرنو قیام:

سماجی تفرقہ سماج کے تمام اداروں (افراد، طبقات اور گروہوں) کے درمیان کمزور سماجی رابطوں کا پتہ دیتے ہیں، ہمیں ان تمام اداروں کے درمیان سخت مخالفانہ تقسیمات ملتی ہیں اور معروف بنیادوں کے تئیں بے یقینی کا احساس عام ہے (یا کم از کم ان کا ایسا ماننا ہے) اور نوخیزوں و جوانوں کا یہ نظر آتا ہے کہ ان اداروں کا جو کردار ہونا چاہئے وہ ہے نہیں، حقوق تلف کئے جا رہے ہیں، ذمہ داریاں ادا نہیں کی جا رہی ہیں، اقدار کا جنازہ نکل رہا ہے، بلا دلیل رویے اختیار کیے جا رہے ہیں، یہ صورت حال دیکھ کر جوانوں کو اپنے ضیاع اور امان کے نظریہ کی نایابی کا احساس ہے، وہ رجحان کا جائزہ لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں، نتیجتاً وہ کسی پروپیگنڈہ کے اسیر ہو جاتے ہیں، وہ جو سنتے ہیں اس پر انہیں یقین نہیں آتا، جو قریب ہوتا ہے وہ اس سے بچتے ہیں، اور اجنبی سے قریب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ غلو پسند جماعتوں میں شمولیت ان معاشروں میں زیادہ ہوتی ہے، جہاں سماجی رابطہ کمزور ہو جاتے

ہیں، اور الگ تھلگ و مظلوم ہونے کے احساسات پائے جاتے ہیں، پھر نتیجتاً باہمی نفرت پائی جاتی ہے۔ معاشرہ کے طبقات کے درمیان غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے متوسط طبقہ کمزور اور بے کردار ہو جاتا ہے، اور معاشرہ میں صرف دو طبقات پائے جاتے ہیں: ١- وہ اعلیٰ طبقہ جو صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے اور ملکیت کو اپنا حق سمجھتا ہے، ٢- وہ ادنیٰ طبقہ جس کے حق پر ناحق قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ اس وقت صورت حال بہت خراب ہو جاتی ہے جب اعلیٰ طبقہ ادنیٰ طبقہ کے کچھ لوگوں کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرتا ہے، مرکزی اتھارٹی اور اس کے اداروں کی کمزوری کی وجہ سے ان دونوں طبقات کے درمیان دوری بڑھتی چلی جاتی ہے، اور گونا گونی سبب تعارف ہونے کے بجائے سبب مخالفت ہو کر اپنا شرعی ہدف کھو دیتی ہے۔

اس لئے سماجی توازن کے حصول کے لئے ایسی پالیسی کی ضرورت ہے جو نتیجہ خیز تعاون کے مطابق تمام افراد و جماعتوں پر حاوی سماجی تشکیل کو وجود میں لائے۔ اس توازن کو وجود میں لانے اور اپنی ذمہ داریوں و کرداروں کی بابت بیداری لانے کے لئے انفرادی واجتماعی تربیت کو کما حقہ مقام دینا چاہئے، معاشرہ کی طبقاتی تقسیم میں ازسرنو توازن اعلیٰ وادنیٰ طبقات کو ایک دوسرے کی رعایت کا پابند بناتا ہے۔ اسلام کا ایک رکن ''زکاۃ'' اس سلسلے میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، ایک باہم متعلق معاشرہ کی تشکیل انتہاپسند رجحانات اور غلو پسند جماعتوں کے لئے میدان کو تنگ کرتی جاتی ہے۔

د- سیاسی رجحان کی صحت:

عام طور پر جہاد کی بابت غلو سیاسی انفرادیت وتسلط والے نظاموں میں پایا جاتا ہے، یعنی اس وقت جب کہ کوئی فرد یا چند افراد، کوئی پارٹی یا مملکت حکومت پر قبضہ کرے اور اپنی رائے تھوپے۔ صورت حال اس وقت اور خراب ہو جاتی ہے جب حکومت پر قابض یہ لوگ صلاحیت وانصاف سے بے بہرہ ہوں، اور متعین صحیح نظریہ یا سوچی سمجھی صحیح پالیسی نہ پائی جائے، اور متعین صحیح نظریہ یا سوچی سمجھی صحیح پالیسی نہ پائی جائے، اور مملکت حکمرانوں کی عقل ومرضی کے مطابق چل رہے ہوں۔

بسا اوقات یہ انفرادی رجحان چند خوشنما اصولوں اور نظریات کو اپنی بنیاد بناتا ہے، لیکن

ان اصولوں ونظریات کو صحیح طور پر عمل نہیں دلایا جاتا ہے، یہ لوگ فقہ دین سے ماخوذ تصورت کو ایک تاریخی عمل قرار دیتے ہیں، بالخصوص اس لئے بھی کہ یہ اس کو اس طرح توڑ مروڑ نہیں سکتے ہیں، جس طرح جدید تصورات کے ساتھ کرتے ہیں، ان کے نزدیک جمہوریت، کمیونزم، سرمایہ داری، سوشلزم، صاف ستھرے انتخابات اور اکثریت کی پارلیمنٹ نیز برسراقتدار پارٹی اور حزب مخالف...... یہ تمام تصورات ان تمام تصورات سے مقدم ہیں جو اسلامی جڑیں رکھتے ہیں، بلکہ ''دستوری ماہر'' کا لفظ استعمال کرنا چاہئے تاکہ دینی سرچشمہ سے دوری ہوسکے۔

یہ پہلو ان اسلامی ومشرقی معاشروں میں بہت غلط ہے جن کی شخصیت کا بنیادی عنصر تدین ہے، معاشرہ کا ایک حصہ اکثر سیاسی مسائل اور ان سے نپٹنے کے طریقوں سے ناواقف ہوتا ہے، ایک حصہ ان تصورات اور ان کی علمی صورت کو بگاڑ کر پیش کرتا ہے، ایک اور حصہ سیاست سے دوری بنا کر رکھتا ہے، نتیجتاً لوگوں میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے، اور ان میں سے کچھ کے ذہن میں اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ اس نظام کا خاتمہ ضروری کام بلکہ شرعی فریضہ ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذریعہ اس کام کی انجام دہی کا شرعی حق انہیں حاصل ہے۔

ایک بار پھر وہ ماحول وجود میں آجاتا ہے جس میں واضح نظریہ غائب ہوتا ہے اور بے یقینی کے احساسات عام ہوتے ہیں، ان افراد پر ان لوگوں کی اطاعت لازم کی جاتی ہے جنہیں ان کے نزدیک معاوضہ کے لئے مناصب دیے جاتے ہیں۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ تمام افراد اور جماعتوں کے لئے ان کی صلاحیتوں کے مطابق سیاسی شرکت کے میدان کھول دینے چاہیں، یہ شرکت فرد، جماعت، ریاست، اس کے ارتقائی پروگرام اور رضا کارانہ تنقیدی صلاحیتوں کے سیاسی کردار کی صحیح صلاحیت وواقفیت پر مرکوز ہو، یعنی منصوبہ کی تنفیذ میں سب لوگ حصہ لیں، اور معاشرہ کے کسی بھی حصہ کو محروم نہ رکھا جائے، یہ تہذیبوں سے استفادہ سے زیادہ صلاحیتوں کے استعمال کی پالیسی ہے، اسرائیلی پارلیمنٹ (کنیسٹ) کی مثال ایک ایسے میدان کی ہے جس میں کئی مخالف فریق جمع ہوتے ہیں، ان کے نظریات واصولوں میں بھی فرق ہوسکتا ہے، لیکن وہ ایک متفقہ پالیسی نافذ کرتے ہیں، اور

وہ ذمہ داروں کو اس ایک ہدف کے حصول کا متوازن طریقہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں، جس سے ہم تو غافل ہوسکتے ہیں، لیکن وہ اس سے سرمو انحراف نہیں کرتے ہیں۔

سیاسی اصلاح کے نظام کو مناسب پہلوؤں پر مشتمل ہونا چاہئے، نہ کہ ان انتہا پسندانہ پہلوؤں پر جو غلو پر مبنی کینسر پیدا کرتے ہیں۔

مراجع ومصادر

عربی مصادر:

۱- عيسى، محمد رفقى(۱۹۸۳) فى النمو الأخلاقى: النظرية، البحث، التطبيق، كويت:دارالقلم

۲- عيسى، محمد رفقى(۱۹۸۴) توضيع القيم...... أم تصحيح القيم: نحوإستراتيجية جديدة فى الإرشاد النفسى_المجلة التربوية- جامعه كويت، ۳،۴۳-۷۳_

۳- عيسى، محمد رفقى (۱۹۸۸) مصادر التطرف كما يدركها الشباب فى مصر والكويت: دراسة حضارية مقارنة، مجلة مركزالبحوث التربوية-جامعه قطر، ۱۳،۷۷-۱۰۳_

۴- اليوسف، عبدالله بن عبدالعزيز(۱۴۲۵ه) الأمن مسئولية الجميع: رؤى مستقبلية_ كلية الملك فهد الأمنيه، ریاض میں (۲۱-۲۴/۲/۱۴۲۵ھ) کو منعقد ہونے والی کانفرنس بعنوان 'ندوة المجتمع والأمن' میں پیش کیا گیا مقالہ۔

غیرعربی مصادر:

1. Bartoli, A.& Coleman, P.T.(2003). Dealing with Extremists.In Guy Burgess & Heidi Burgess (eds), Beyond Intracotability, Conflict Research consortium, University of Colorado, Boulder. Available at: http://www.Beyondinteractability.org/essay/dealing_extremisti/
2. Chua, A.(2003) World on Fire:How Exporting Freemarket democracy Breeds Hatred and Global Instability. NY:Doubleday.
3. Ezekiel, R.S.(2002). An ethnographer looks at neo-Nazi and Klan groups: The Racist Mind revisited.American Behavioral Scientist, 46(1), 5171.
4. George, J.& Wilcox, L.(1996). American Extremists: Militias Supremacists, Klansmen, Communists and others. N.Y: Prometheus Books.
5. Glaser, J.; Dixit, J. & Green, D.P.(2002). Studying hate crime with the Internet: What makes racists advocate racial violence? Journal of Social Issue,58(1),177193-.
6. Gruen, A. (2003), An Unrecognized pathology: The mask of humanness. Journal of Psychohistory, 30(3,266272-.
7. Gutierrez, J.(2004). Humanization of Extremists. In Guy Burgess & Heidi Burgess (eds.), Beyond Intractability, Conflict Research Consortium, University of Colorado, Boulder.
8. Hogg, M.A. & Terry, DJ.(2000). Social identity and self-categorization processes in organizational

contexts. Academy of Management Review 25,121140-.
9. Kooros, Carmel (2006). Research Base for the High Level Group Report Youth, Summary of research based on commissioned paper.A paper prepared by the Alliance of Civilization Secretariat, United Nations, New York.
10. Saulsman, L.M. & Page, A.C. (2004). The five-factor model and personality disorder empirical literature: A meta-analytic reviewer. Clinical Psychology Review. 23,10551085-.
11. Seyle, D.C.(2007). Identity Fusion and the Psychology of Political Extermism. Unpublished Doctoral Dissertation, the University of Texas at Austin.
12. Seyle, D.C. & Swan, W.B. Jr.(2006), Religious fundamentalism, Talk presented to the annual conference of the Society for Personality and Social Psychology in Plam Springs, CA (Jan.2006).
13. Seyle,D.C. & Pennebaker, J.W.(2007). The language of political extremism. Talk presented to the annual conference of the Society for Personality and Social Psychology in Memphis, TN (Jan.2007).
14. Shamir, M. & Sagiv-Schifter, TN (Jan.2006). Conflict, identity, and tolerance: Israel in the Al-Aqsa intifada. Political Psychology, 27(4),569695.
15. Sherif, M.(1966). Group Conflict and Cooperation: their Social Psychology. London: Routledge & Kegan Paul.